BOOK HOME
قہقہہ انسان نے ایجاد کیا
حسین عابد
مسعود قمر
جاوید انور
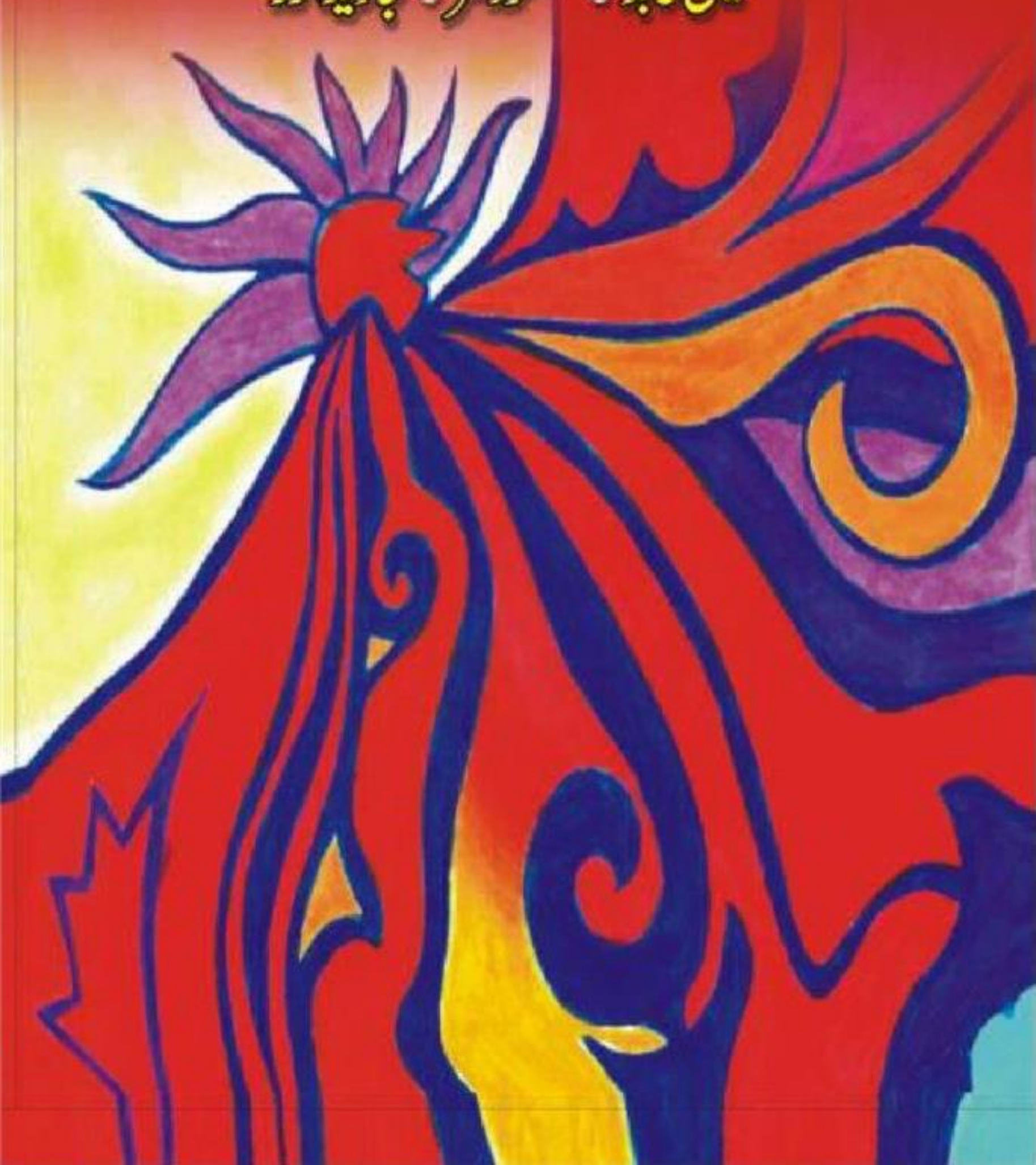
تخلیقی اشتراک کے اس تجربے کے نام
جس سے نئی دنیاؤں کا سراغ ملا

فہرست

آفتاب اقبال شمیم

تین شاعر۔۔۔ایک نئی نظم کی جستجو میں

یہ مجھے اپنی نظم اقلیم خبر سے باہر کی دُنیا کا واقعہ لگتا ہے کہ یورپ میں آباد تین شاعروں نے فکر و وجدان کے اشتراک میں نظموں کا ایک مجموعہ تخلیق کیا ہے اور جہاں تک مجھے علم ہے اس مجموعے کی ہر نظم ان تینوں شاعروں کی مشترکہ تخلیقی کاوش سے گزر کر ثمر ور ہوئی ہے۔ تین شاعر ایک نظم۔ یہ ایک اچھوتا اور حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ کیا کوئی ایسا دن بھی آئے گا جب انسانی بستیوں میں سارے شاعر مل کر ایک نظم لکھا کریں گے؟ اپنی فکر اور حساسیت کے اعتبار سے یہ تینوں شاعر مکمل شاعر ہیں۔ جاوید انور آسٹریا میں رہتے ہیں۔ ایک زمانے سے میرا اُن سے داخلی ربط ہے۔ وہ نئی نظم کے معتبر اور اہم شاعر ہیں۔ حسین عابد جرمنی میں مقیم ہیں۔ اُن کی غزلوں اور نظموں کی کتاب ''دُھندلائے دن کی حدت'' میری نظر سے گزری ہے۔ وہ ایک اچھے اور منجھے ہوئے شاعر ہیں۔ ان کی نظموں میں اُردو شاعری کا عصری روّیہ رچا بسا ہوا ہے۔ اس طرح مسعود قمر جو سویڈن کے زمستانی ہیں، ایک سنجیدہ اور بھرپور شاعر ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ اُن کے نثری نظموں کے مجموعے ''سوکھی گھاس کا نظم پڑھنے سے انکار'' کا دیباچہ ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے لکھا ہے۔ اس دیباچے میں مسعود قمر کی اپنی طرز کی منفرد اور مختلف نظموں پر کافی گہرائی میں جا کر گفتگو کی گئی ہے۔

زیرِ نظر سہ کاوشی مجموعے کی نظمیں ان شاعروں کی تخلیق کردہ انفرادی منظومات سے خاصی مختلف نظر آتی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ مشترکہ مشاورت میں ایک نیا تجربہ کرنے کی حوصلہ مند کوشش کی گئی ہے۔ اُنھوں نے تہذیبی رو میں چلتی ہوئی زندگی کے معمولات کو ان نظموں کا موضوع بنا کر اپنے آپ کو دہرایا نہیں۔ مثلاً اس مجموعے میں شاید چند نظمیں ہی ایسی ہوں گی جن میں ان شعرا حضرات نے اپنے پرانے ثقافتی منظر نامے کو قدرے تفصیل سے اُجاگر کیا ہو۔ نظم ''کبھی بھیڑیے کو گنگناتے سنا ہے'' کی کچھ لائنیں ملاحظہ ہوں۔۔۔۔

''تم نے ساٹھ کی دہائی میں

لاہور بسر کیا ہوتو

تمھیں پتہ ہو

بھیڑیے

اِچھرے اور چوبرجی کے درمیان

گشت کیا کرتے تھے

میانی صاحب کے قبرستان میں

ہوا اٹھکیلیاں کرتی

تو مُردے مالکونس گاتے

اور مال روڈ پر چلنے والے

میٹھے جامنوں سے

اپنے ہونٹ رنگین کر لیتے

اس طرز کی فلیش بیک صرف اسی نظم میں وارد ہوئی ہے جو ایک مانوس معنی کی ترسیل کا سبب بنتی ہے۔ لیکن غور سے دیکھیں تو ان نظموں کے موضوعات اتنے وسیع اور متنوع ہیں کہ اس مجموعے میں مذکورہ موضوع کی گنجائش ہی اتنی بنتی ہے۔ موضوعات اور مضامین کی یہ کثرت بہر طور روایتی یا مروجہ نظم نگاری میں برتی گئی شعری منطق سے اختلاف کر کے شعری استدلال کا ایک الگ راستہ اختیار کرتی ہے۔ ان شعرا حضرات نے اپنی متخیلہ کی مہم جوئی میں نظم کا کینوس اتنا وسیع کر دیا ہے کہ وہ موجود و مابعد کی کسی شے یا تصوراتی ہیت کو اپنا موضوع بنا سکتی ہے۔ اور اپنی آزادہ روی میں ترسیل معنی کی حد بندی سے گزر کر تشکیل معنی کا اختراعی سفر اختیار کر سکتی ہے۔ یہ لائنیں دیکھیں.........

''کوئی چیز غیر موجود نہیں

غیر تمہیں کہیں بھی مل سکتا ہے

لڑکیاں سمندر میں

چاند بستر میں

اور

دریا واش بیسن میں نہاتے ہوئے

(رقص خوری ضروری نہیں)

اب دریا کو واش بیسن میں نہاتے ہوئے دیکھنے کا تجربہ ایک نظم کے توسط سے ہی کیا جا سکتا ہے جو اپنے نئے امکان میں اکائی کو کسی نئی جائے مشاہدہ پر بھی تلاش کر لیتی ہے۔ نظم ''روحوں کا پرندے بننا'' کی پہلی تین اور آخری تین لائنیں دیکھیں.........

جزیروں کی روحیں

کھلے سمندروں میں

نہاتی ہیں.......

روحیں کبھی بھی

پرندوں کا روپ دھار سکتی ہیں

اور سمندر ان کے پیچھے اڑتا ہے

یہ نظم ہمیں دفعتاً عہد اساطیر میں لے جاتی ہے۔ فطرت کی موجودات کو ذی روح مخلوق کی جون میں دیکھنے کا عمل تصوراتی بھی ہے اور

تخلیقی بھی۔ نظم اپنے موضوع کے چناؤ میں لامحدود امکان رکھتی ہے۔ یہ کسی ایک وقت یا زمانے کی پابند نہیں بلکہ وقت سے ماوقت کی طرف سفر کرتے ہوئے زیادہ فراغ میں رہتی ہے۔ اب ایک اور نظم ''پیالے میں پڑے بادام'' کی چند لائنیں ملاحظہ کریں.......

شمالی دریاؤں پہ

جنوبی خواب دیکھنے میں

کیا حرج ہے.........

رات کے بھگوئے بادام

پیالے میں پڑے ہنس رہے ہیں

عورت

آنکھوں کے پیالوں میں

بے سمت خواب لیے

سورج کے نیچے کھڑی ہے

قافلے میں

گدھے، گھوڑے، انسان

سب مسافر ہیں

اگر ہم اس نظم میں روزمرہ کی منطق تلاش کریں تو شاید ہمیں نہ ملے۔ اس کے باوجود یہ نظم کوئی چیستان نہیں۔ اس میں تجرید اور امیجزم کی تکنیک برتی گئی ہے۔ جس نے اسے ایک مجرد پینٹنگ کی طرح تاثراتی اور معنی خیز بنا دیا ہے۔ بہر طور کھلی ہیت کی یہ نظم معین روایت کے مطابق کسی مرکزی خیال کے تابع نظر نہیں آتی ان نظموں کا ایک اور نمایاں وصف ان میں موجود حس مزاح، ہلکے سے تمسخر اور طنز کا عنصر ہے۔ جس سے ان کی قرأت میں اک گونہ لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ لائنوں کو فرداً فرداً پڑھنا آسان لگتا ہے لیکن ایک نظم کی سب لائنوں کو جمع کر کے پڑھنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے، لیکن یہ تاثر قائم رہتا ہے کہ ہم نظم کے ایک نئے تجربے سے گزر رہے ہیں۔ ذرا یہ نظم ''چوگا کھلاتی مستورات'' دیکھیں.......

خس کی ٹٹیوں کے پیچھے

بوڑھے ترازو سامنے رکھے

شاعری کر رہے ہیں

اُن کی ان چھوئی مستورات

مرغا بنے لڑکے کو

اپنا اپنا چوگا کھلا رہی ہیں........

اس نظم کی پہلی چار لائنوں میں بتایا گیا ہے کہ کڑکتی دوپہر میں، دیوار کے پاس، مرغا بنا لڑکا، فارغ وقتوں کی نظمیں لکھ رہا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ نظم میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ ایک محاکاتی عمل میں ایک منظر اور ایک سرگرمی کو پیش کر دیا گیا ہے۔ اصل مسئلہ فارغ وقت کی نظموں کا ہے۔ اس سرگرمی سے بوڑھے مدت ہوئی گزر چکے ہیں۔ اب وہ فارغ وقت میں لکھی یا سوچی نظموں کو عروض کے ترازو میں تول کر سکہ بند، برانڈڈ نظمیں لکھ رہے ہیں۔ شاید یہ کسی ذاتی مشاہدے یا کسی یاد کی ناتمام امیجز میں تصویر کشی کی ایک جھلک پیش کرتی ہو۔ نظم کیا ہے؟ شاید اس کی تعریف ایک نئی شعریات کی متقاضی ہے۔

یہ نظمیں متنوع موضوعات اور امیجز سے مالا مال ہیں۔ بعض امیجز نظم کے اندر نظم پیدا کرنے کا تخلیقی حسن رکھتے ہیں۔ مثلاً

تمباکو کو کاغذ میں لپیٹنا

مَیں نے آوارہ گردی سے سیکھا

برف میں سوراخ کر کے مچھلی نکالنا

مجھے تمھاری یاد نے سکھایا

اس مجموعے میں ایسی نظموں کی تعداد بھی کم نہیں جو خیال یا امیج کی اچانک شفٹنگ سے گریز کرتے ہوئے موضوع کی مرکزیت کو آخر تک برقرار رکھتی ہیں۔ مثلاً ''ارض مخلوقیت کی ٹِک ٹِک'' ''برف میں دبی خزاں'' ''درختوں میں چھپی زندگی'' وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جو عصری محاورے میں لکھی گئی ہیں۔ ان نظموں میں مضمون کی ندرت کوئی مشکل پیدا نہیں کرتی اور معنی کی مکمل ترسیل ہوتی ہے۔

تین نظم گو شاعروں کی یہ مشترکہ تخلیقی کاوش ایک نئے تجربے کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ تجربہ اپنی ہی طرز کی تلازماتی منطق کے زور پر نظم وضع کرتا ہے اور دُنیا و مافیہا کے کسی بھی موضوع کو کسی نظری یا فلسفیانہ اُلجھن میں پڑے بغیر نظم کی شکل دے سکتا ہے۔ یہ تجربہ سریلزم، شعور کی رو، ایبسرڈٹی، تجریدیت وغیرہ جیسے تجربوں سے مختلف ہے۔ ایسی نظمیں لکھنے میں مشکل نظر آتی ہیں لیکن لکھی جا سکتی ہیں۔ ہر نیا تجربہ اس لیے بھی لائقِ تحسین ہوتا ہے کہ وہ ایک بحث کا در کھولتا ہے۔ نظم کیا ہے؟ شاید یہ سوال اس بحث کا نقطۂ آغاز ہے۔

قہقہہ انسان نے ایجاد کیا۔ ایک تاثر

''قہقہہ انسان نے ایجاد کیا'' کے تخلیق کار حسین عابد، مسعود قمر اور جاوید انور اپنے مشترکہ شعری مجموعے کے ذریعے غالباً یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قدرت اپنی ستم ظریفیوں پر تبسم سے آگے نہیں جاتی جبکہ انسان قدرتی مظاہر کی ستم ظریفیوں پر قہقہہ بھی لگا سکتا ہے۔
سب سے پہلے تو یہ عرض کروں کہ میری ادبی زندگی میں یہ پہلا موقع ہے کہ میرے سامنے تین ہم عمر شعراء کا مشترکہ کلام آیا ہے۔ دنیائے ادب اس نوع کی صرف ایک یا دو مثالیں پیش کر سکتی ہے اور وہ بھی مغربی منطقہ سے۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مشرق کے بعض اہم اور بڑے کلاسیکس کے بارے میں جن میں الف لیلیٰ، رامائن، مہابھارت اور بہت سا منظوم لوک ادب شامل ہے۔ ''مشترکہ'' کاوشیں سمجھی جا سکتی ہیں لیکن اب یہ طے کرنا کہ ان تخلیقات کے کس حصے کا تخلیق کار کون ہے بہت مشکل ہے۔ یہ کلاسیکس اس درجے مقبول ہو چکے ہیں کہ ہم ان تخلیقات کو ''مرکب'' سمجھتے ہوئے تخلیق کاروں کے تعین کو لایعنی کام سمجھتے ہیں۔

حسین عابد، مسعود قمر اور جاوید انور نے زیر نظر مجموعے کی نظموں کو مشترکہ طور پر تخلیق کیا ہے یعنی ان شعراء کے درمیان پہلے نظم کے عنوان پر اتفاق ہوا اور پھر ہر ایک نے اس نظم کی تخلیق میں اپنا حصہ ڈالا اور پھر اپنے نتیجہ فکر پر رضامندی ظاہر کی۔ اس طرح تین دوستوں کی یہ ٹیم جدید اردو شاعری میں ایک منفرد شعری مجموعے کی خالق ہو گئی۔ میں نے شاعروں کو بارہا ایک دوسرے کے مصرعے پر سخن آزمائی کرتے دیکھا اور سنا ہے اس لحاظ سے یہ باقاعدہ مشترکہ کوشش خوش آئند ہے۔

جن قارئین کی نظروں سے مسعود قمر کا تازہ شعری مجموعہ ''سوکھی گھاس کا نظم پڑھنے سے انکار'' وہ اس ٹیم کے ایک شاعر کی ذہنی دنیا سے واقف ہو گئے ہوں گے۔ میں نے مسعود قمر کے توسط سے باقی شعراء کا کلام بھی جستہ جستہ دیکھا ہے۔ ان سب کا ذہن وجودی ہے اپنے اردگرد سے اس درجہ متغائر (alienated) ہے اور ایک ایسی دنیا کی تخلیق میں مصروف ہے جس کے باشندے وہی ہو سکتے ہیں جو ان تینوں کی سوچ سے متفق ہوں۔ وجودی فکر عالم اسباب کے حوالے سے گاہے متفق اور گاہے غیر متفق نظر آتی ہے اور اس کے لئے عرض یا وجود (Existence) جوہر (essence) پر مقدم ہے۔ اس مجموعے نے اپنی فکر ہنوز کسی ایسے نظریے کے ساتھ لازم و ملزوم نہیں کی ہے جو اس دنیا کے طبقاتی اسٹرکچر کو درست خیال کرتی ہو اور اس لئے یہ لوگ ایک ایسی خیالی دنیا کے باشندے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ یہ ''ممکن'' ہے اگر آج نہیں تو پھر کل۔

مثلاً ان نظموں کی پہلی نظم ''روحوں کا پرندے بننا'' سے ایک نکتہ سامنے آتا ہے کہ یہ نظم اس stanza پر ختم ہوتی ہے:

روحیں کبھی بھی

پرندوں کا روپ دھار سکتی ہے

اور

سمندر انکے پیچھے اڑتا ہے

اس استانزہ میں جہاں روحیں پرندے بن کر اڑ سکتی ہیں کی تعجب خیز سطر سامنے آتی ہے وہاں سمندر کا ان روحوں کے تعاقب میں اڑنے کو ممکن بنا کر نظم ایک ڈرامائی نوٹ پر ختم ہوتی ہے جس سے شعرا کی ٹیم قارئین میں ارتعاش پیدا کرنے کیلئے ''ڈرامائی تاثر'' پیدا کرتی ہے اور یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب یہ طریقہ اظہار ''ابلاغ'' کی اہمیت کو ضروری خیال کرتا ہو۔ اس مجموعے کی نظمیں ''پیالے میں پڑے بادام''، ''رات کے لے پالک محافظ''، بے گھری، انصاف کی یونیفارم، پھانسی میں مصروف شخص، نظم کا وزیٹنگ کارڈ اور ''نہ مرنے کا عہد''، لفظ اپنے ننگے پن میں چھپ جاتے ہیں، اور خودکشی ایک محنت طلب کام ہے، متاثر کن نظمیں ہیں

اس مجموعے کے شاعروں نے مغرب سے بہت کچھ لیا ہے۔ یہ بھی کہ وہ شاعری کے لئے اپنے بزرگوں کے شعری رویے کو حقیقت افروز ہونے سے زیادہ عبرت آموز سمجھتے ہیں۔ ان شاعروں کی حقیقتیں اکثر لوگوں کی حقیقتوں سے اس درجہ مختلف ہیں کہ یہ شاعر اپنے علاقے کے قارئین کو تحفے میں وہ احساسات برآمد کرنا چاہتے ہیں جو انھیں مغرب کی باشندگی سے دستیاب ہوئے ہیں۔ اجنبی زبانوں کے خیالات پر پابندی نہیں لیکن جب اپنے مانوس رسم الخط میں دو ردیسوں کے طرز احساس سے مملو سطریں پڑھنے کو ملیں تو پھر عالمیانے (globalization) کا مفہوم اس حد تک سمجھ میں آجاتا ہے کہ ایک علاقے کا طرز احساس، دوسرے علاقوں کی باشندگی کے بعد، اجنبی ہوتے ہوئے بھی اپنا دکھائی دینے لگتا ہے۔ مثلاً ''تابوت سے بھاری وصیت نامہ'' میں نظم کے trigger-points تابوت اور وصیت نامہ دور از کار نہیں ہیں۔ وصیت کی خاطر بوڑھا قرار دیا جانے والا بوڑھا جب اس دنیا سے جانے لگتا ہے تو اس نظم کے شاعروں کے الفاظ میں کچھ یوں لگتا:

''مگر وہ زندہ رہنے کیلئے

خالی ہاتھ نہیں جانا چاہتا

موسیقی، تصویریں، کتابیں

اور بوتلیں ساتھ لے گیا

وارثوں کے ہاتھ

وصیت تھما گیا

جوتابوت سے بھاری
مگر لفظوں سے خالی تھی''

تو اس دور میں جہاں ایک حلقہ کیلئے الفاظ اپنے مفاہیم سے خالی ہوتے جارہے ہیں صرف ایک حقیقت ہی باقی رہ جاتی ہے کہ ہمیں اپنے الفاظ میں معانی کا حمل ٹھہرانے کیلئے ایک ایسی دنیا کو ممکن بنانا ہوگا جس کے پاس ایک بامعنی vision اور ظرف اپنے مظروف سے خالی نہ ہو۔اس دنیا میں معنی اور مشابہہ vision کی تلاش انہی شاعروں کا شیوہ ہوسکتا ہے جو مابعد جدیدیت کے جال میں پھنسنے سے انکار کر رہے ہیں

اس شعری مجموعے کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ اس مجموعے کا اسلوبِ نگارش مسطح ہے اور وہ دولخت یا سہ لخت نہیں ہے۔ مجھے تمام نظموں میں ایک سے زیادہ ذہن کی کارفرمائی نظر نہیں آئی اگر یہ عمل قدرتی ہے تو پھر اس یکسانیت اور معنوی اشتراک پر مبارکباد ہی دی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی
کراچی
۱۸ مئی، ۲۰۱۱

سمندر مرے بادبانوں میں سویا ہوا ہے

سہ پہر کی دھوپ سٹیشن کی دیواروں، پلیٹ فارم اور پٹریوں پر چمک رہی تھی۔ جاوید اور میں فیصل آباد ریلوے سٹیشن کی عمارت کے ساتھ گھاس کے ایک قطعے پر بیٹھے ایک دوسرے کو اپنی شاعری سنا رہے تھے۔ جاوید سے یہ میری پہلی تفصیلی ملاقات تھی۔ میں پنجاب میڈیکل کالج میں انٹرویو اور داخلہ کے کاغذات جمع کروانے کے لئے دو دن کے لئے آیا تھا، جاوید مجھ سے دو سال سینئر تھا، کالج کی لبرل پارٹی ''دی ویلینٹس'' کا سرگرم رکن تھا۔ دو دن میں اس کے کمرے میں ٹھہرا تھا لیکن یہ جاننا مشکل تھا کہ اس کمرے کے اصل مکین کون کون تھے، کمرہ دن رات بھانت بھانت کے لوگوں سے بھرا رہا تھا۔ داخلہ کی کاغذی کارروائیوں سے فارغ ہونے کے بعد جاوید نے مجھے موٹر سائیکل پر بٹھایا اور لاہور کی ٹرین کے لئے فیصل آباد ریلوے سٹیشن پر لے آیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی شاعری سُن کر بہت خوش ہوئے۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ میرے لاأبالی رویے کے برعکس شاعری کو بہت سنجیدگی سے لیتا تھا اور خیال اور تکنیک کی ترقی کے لئے کھلے دل اور جاگتے ذہن سے کوشاں تھا۔ اس نے عبدالرشید اور سرمد صہبائی کا تذکرہ کیا جن کی جدید انداز کی نظموں کا وہ مداح تھا۔

اس سے بغلگیر ہو کر جب میں ٹرین میں داخل ہوا تو ہم دونوں دوست بن چکے تھے۔

اس زمانے میں اس میڈیکل کالج میں اتنے زرخیز تخلیقی دماغ جمع تھے کہ شاید ہی ادب و فن کی کسی درسگاہ میں ہوں گے۔ افتخار فیصل، وحید احمد اور جاوید انور جیسے ذہین اور منجھے ہوئے شاعر، داور آغا اور خالد اعزاز جیسے نفیس مصور، حسیب اطہر اور آقا شوبی جیسے انٹلکچوئل اور ناصر اشرف اور شکیل جیسے موسیقار۔ ہاسٹل کے شب و روز ضیاء الحق کے خلاف انقلاب کے منصوبے بناتے، مخالف سیاسی پارٹیوں سے جنگیں لڑتے، فیض صاحب کی شاعری پر سر دُھنتے، قرۃ العین حیدر اور ہرمن ہیسے پر بحثیں کرتے اور ایک دوسرے پر فقرے کستے گزرے۔ جاوید کا مطالعہ

وسیع تھا اور اس کے سرہانے قدیم و جدید شاعری کی کتابیں بدلتی رہتی تھیں، وہ الماریوں کے کواڑوں اور کمرے کی دیواروں پر شعر لکھتا رہتا، اس کی نئی تخلیق کا سب کو انتظار رہتا، وہ جب اپنے طویل قدموں سے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اپنی دلربا مسکراہٹ میں اعلان کرتا، لو ہوگئی ہے، تو سب لوگ اپنی فقرہ بازی بھول کر ہمہ تن گوش ہو جاتے۔ نوجوانی میں وہ سرگودھا میں خورشید رضوی صاحب سے اصلاح لیتا اور وزیر آغا کی محفلوں میں بیٹھتا تھا، لاہور جاتا تو فنون کے دفتر میں احمد ندیم قاسمی، خالد احمد اور نجیب احمد کی صُحبت میں بیٹھتا۔ وہیں اس کی ملاقات اختر حسین جعفری سے ہوئی جن کی نظموں کو وہ اخباروں اور ادبی پرچوں میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھتا تھا۔ آئنہ خانہ چھپی تو میں نے اپنی نحیف جیب سے خرید کر اسے پیش کی۔ ہم سب ان دنوں اختر حسین جعفری کے سحر میں تھے۔ ان کی امیجری نے ہمیں باندھ لیا تھا۔ ان دنوں جاوید کی شاعری پر اختر حسین جعفری کا رنگ چڑھا، جس پر ہم دوستوں نے اسے اس بات کا احساس دلایا۔ متاثر ہونا ایک فطری عمل ہے اور کبھی کبھی ایک تخلیق کار کسی دوسرے کے سحر میں اس طرح آجاتا ہے کہ اس کے انداز پر دوسرے کی چھاپ نظر آنے لگتی ہے لیکن ایک سچا تخلیقی دماغ بہت عرصہ اس اغواء کے قابو نہیں رہتا اور دوسرے کے چند رنگوں کی چھوٹ لے کر اگلی وادیوں اور گزرگاہوں کا رُخ کرتا ہے۔ جو جاوید نے کیا۔

کالج میں چھٹیاں تھیں، ہاسٹل تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ میں نے اور جاوید نے چند دنوں کے لئے کمرے سے نہ نکلنے کا فیصلہ کیا۔ ان دنوں میں ہم نے کمرے میں پڑے ایک چھوٹے سے ہیٹر پر نئے کھانے ایجاد کئے اور مل کر نظمیں لکھیں۔ جاوید نے نہایت سنجیدگی سے ایک نظم شروع کی:

مثنوی در مدح پیر

ضیاء الحق

ہمارے واسطے تو ابرِ رحمت ہے

یہاں سب لوگ اپنی منہدم ہوتی ہوئی چھت پر کھڑے ہیں

اور اذانیں دے رہے ہیں

دیے جاتے ہیں مگر بارش نہیں تھمتی

لیکن مہذب زبان اس موضوع پر زیادہ دیر ہمارا ساتھ نہ دے سکی اور ہم کھلے لفظوں میں اظہار پر اُتر آئے جس کے باعث یہ معرکتہ الآراء نظم شائع ہونے سے قاصر رہی اور صرف چند دوستوں تک پہنچی۔ مشترکہ شعری کاوش کا یہ چسکہ بہت برسوں بعد رنگ لایا جب ہم سب لوگ دنیا کے مختلف گوشوں میں بکھر چکے تھے۔ یورپ کی سرد راتوں میں انٹرنیٹ اور سکائپ نے ہمیں پھر سے ایک جگہ جمع کیا، مسعود قمر، جاوید اور میں نے مل کر سو سے زیادہ نظمیں تخلیق کیں جو کتابی صورت میں ''قہقہہ انسان نے ایجاد کیا'' کے نام سے اشاعت کے مراحل میں ہیں۔

جاوید نے کالج کے بعد بحثیت ڈاکٹر لاہور کے مضافات میں سرکاری ملازمت اختیار کی، میں نے روزمرہ کے استبداد و ذلت و جبر سے تنگ آ کر آوارگی کی صدا پر کان دھرا اور ملک چھوڑ دیا۔

جاوید انور کی پہلی کتاب ''شہر میں شام'' چھپی تو ادبی حلقوں میں تہلکہ مچ گیا، جدید نظم میں اس کا اثر کتنے لکھنے والوں پر ہوا اس کا اندازہ اردو ادب کا کوئی بھی ذہین قاری کر سکتا ہے۔

جاوید کی بیوی اور میری منہ بولی بہن ماریہ نے پاکستان سے آسٹریا مراجعت کرتے ہوئے لمبا راستہ اختیار کیا اور لندن میں میرے لئے جاوید کی کتاب لے کر آئی، اس رات ہم نے اس بچھڑے ہوئے محبوب کے بارے کتنی باتیں کیں۔

وہ اپنی زمین نہیں چھوڑنا چاہتا تھا، وہ وہاں کا حصہ تھا اور یہ بات جانتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی ہستی اور پہچان وہیں تھی۔ وہ وہاں نہیں جانا چاہتا تھا جہاں ''ناں کوئی ساہڈی ذات پچھانے، ناں کوئی ساہنوں منے۔''

اس کے مریضوں، دوائیوں، متعلقین اور طلبہ و طالبات میں بکھرے دنوں کی شام دوستوں میں ہوتی تھی۔ اس کے قہقہوں اور چبھتے جملوں سے بڑے بڑے علمدان ریر کے رہتے تھے۔ اسے جاننے، اپنے فہم کو کشادہ کرنے اور دل کو تازہ رکھنے کی لگن تھی۔ اس دوران اسے شاعری کے ''اینگری ینگ مین'' کا خطاب ملا۔ وہ کھلے دل والا، یاروں کا یار اور محبتی آدمی تھا اور اپنی جیب اور جذبے کو ایک طرح بانٹتا تھا۔ وہ تنخواہ سے دوائیاں خرید کر سرکاری ہسپتال میں رکھتا تھا اور سڑک پر کھڑے ہو کر مجہول ادیبوں پر آوازے کستا تھا۔ وہ پاک ٹی ہاؤس میں داخل ہوتا تو بحثوں میں شدت آ جاتی، آوازیں بلند ہوتی ہوتی جھگڑوں میں بدل جاتیں۔ شام ڈھلے وہاں سے نکلتا تو وہ کسی کو منا رہا ہوتا یا کوئی اسے منا رہا ہوتا۔ اس کے غصے سے سب ڈرتے تھے، اس

کی شاعری سے سب مرعوب تھے۔ نوجوان اس کے اسلوب کی نقل میں بے عقل ہو رہے تھے۔

چند سال اس نے فیصلے کی کوشش میں گزارے پھر وہ اپنی محبت اور محنت سے بنائی زندگی چھوڑ کر آسٹریا چلا آیا۔ میں جرمنی آچکا تھا، ہمارا ملنا جلنا دوبارہ شروع ہو گیا۔

زالسبرگ کی نواحی برف میں چلتے ایک بار اس نے کہا کہ وہ شاعری سے اکتا چکا تھا، یہ ایک فضول کام تھا، وہ چاہتا تھا کہ شاعری سے مکمل قطع تعلق کر لے۔ اس کی یہ خواہش سچی نہ تھی، کچھ عرصہ شاعری سے خالی دماغ رہنے کے بعد اس نے پھر نظمیں لکھنی شروع کر دیں۔ وہ گنسبرگ، لورکا، ایلیٹ، ایذرا پاونڈ اور دانتے کے ساتھ وقت گزارتا تھا۔ کتاب بات کرتے، کھانا کھاتے اور رفع کرتے، ٹرام پر چڑھتے یا سرخ اشارے پہ گاڑی روکے ہوئے اس کے ہاتھ میں ہوتی۔ کتاب کا جنون اسے بچپن سے تھا، یورپ کے افرادی زندگی کے رویے نے اسے تقویت دی۔

اس کی شاعری کی ایک جہت جو اپنے پیشے سے لگن نے اس کو دی، دانائی اور دیوانگی کی سرحد کے معاملات، جو اس نے سائیکائٹرسٹ کے طور پر دیکھے اور سمجھے اور اپنی طبیعت کی شدت و اُفتادگی میں جس طرح اس نے انہیں نظم کیا، وہ جدید اردو شاعری میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

ہم دونوں چند دنوں کے لئے لاہور میں اکٹھے تھے۔ ایک پورا دن ہم نے مال روڈ اور نواح میں کتابوں کی ورق گردانی میں گزارا۔ جاوید نے بہت سی کتابیں اکٹھی کیں جو ہم اپنی مشترکہ کتاب کے پبلشر رانا عبدالرحمٰن اور سرور صاحب کے پاس لے آئے جہاں کتابوں کا ایک ڈھیر جاوید پہلے ہی لگا چکا تھا۔ وہ پارسل بحری جہاز پر اس پتے کی جانب رواں ہے جس کا مقیم جزیروں، برگدوں، محرابوں، خوابوں چمنیوں، گراریوں، لڑکیوں، ستاروں، جگنوؤں اور دوستوں سے اچانک بہت دور جا چکا ہے۔

حسین عابد

۵ تا ۹ دسمبر ۲۰۱۱ء

روحوں کا پرندے بننا

جزیروں کی رُوحیں
کُھلے سمندروں میں
نہاتی ہیں
جہاز راں کو پانیوں پہ
بچ بچ کے چلنا پڑتا ہے
سمندر ویسے ہی حاسد ہے
کسی کو کشتی میں
بیٹھا نہیں دیکھ سکتا
کچھ ملاح سمندر کی محبت میں
بغیر چپو کے کشتی چلاتے ہیں

پرندے ان سب پہ ٹھٹھا کرتے ہیں
اور
نہاتی روحوں سے چونچیں لڑاتے ہیں

روحیں کبھی بھی

پرندوں کا رُوپ دھار سکتی ہیں

اور

سمندر اُن کے پیچھے اُڑتا ہے

سرکنڈوں میں چُھپی نظم

نظم بوسے سے پیدا ہوئی
اور سرکنڈوں میں چُھپ گئی
مَیں نے اُس کی تلاش میں
آدھا جنگل قلم کر دیا

ایک ہاتھ میں عورت
اور دوسرے میں نظم تھامے
جنگل سے نہیں گزرنا چاہیے
عورت جنگل میں
اپنے صدیوں پرانے قدموں کے
نشان پہچان لیتی ہے

عورت اور نظم
ایک دوسری میں چُھپ گئیں
سرکنڈوں نے بوسہ زخمی کر دیا

پیالے میں پڑے بادام

شمالی دریاؤں پہ
جنوبی خواب دیکھنے میں
کیا حرج ہے

رات کے بگھوئے بادام
پیالے میں پڑے
ہنس رہے ہیں

عورت
آنکھوں کے پیالوں میں
بے سمت خواب لیے
سورج کے نیچے کھڑی ہے

قافلے میں

گدھے، گھوڑے، انسان

سب مسافر ہیں
سب کے پاس اپنے اپنے
خوابوں کا زادِ راہ ہے

گدھے اور گھوڑے نے
انسان کو اپنے خواب
کھلانے سے انکار کر دیا

اسی جنگ میں
خچر پیدا ہوا
جو پیالے میں پڑے بادام کھا کر
شمالی دریاؤں پہ
جنوبی خواب دیکھ رہا ہے

موٹی بارش کے بلبلے

مَیں اپنے سب کام
پیدائش سے پہلے نمٹا چکا تھا
یہ اُنھی کاموں کا نتیجہ ہے
کہ مَیں موت کا منتظر ہوں

پیدائش کے وقت
مَیں نے انتظار نہیں کیا
مَیں نے چشمے کو پھوٹتے سنا
اور بہتا ہوا باہر آ گیا

کیا وہ موٹی بارش کے بلبلے تھے
جو پھٹ نہ سکے؟
مَیں موت سے پہلے
اپنی پیدائش میں جانا چاہتا ہوں

کنیزوں کی شرارتیں

اذان گیت نہیں بن سکتی
تم اذانوں سے بارش رکوا سکتے ہو
بارش کروا سکتے ہو
لیکن پرندے اور مینار میں فرق ہے
گو وہ دونوں ایک ہی جگہ پر رہتے ہیں
حرم سرا میں کنیزیں
شرارتوں پہ تُلی ہوئی ہیں
حرم سرا میں خواجہ سرا ہے
نہ بادشاہ ہے
بس اک خدا ہے
جو پنگھوڑے میں لیٹا اذانیں دے رہا ہے

رات کے لیے پالک محافظ

رات

کانوں کے پردے پھاڑ دے گی

مجھے بند اور کھلی جگہوں سے بچنا چاہیے

مَیں نے گلیوں اور سڑکوں کو

اپنی پناہ گاہ بنالیا ہے

مگر

سڑکیں میری رفتار سے تھک کر

شائیں شائیں کر رہی ہیں

گلیاں میرے رستوں میں الجھ کر

ایک دوسری کو پکار رہی ہیں

کھمبوں پر لٹکے شہوانی اشتہار

بغیر ہوا کے پھڑ پھڑا رہے ہیں

١٧

دن میں سوئی ہوئی رات
ابھی تک میرے تعاقب میں ہے

جنگل کے درندے
اور شہر کے فلسفی
رات کے لے پالک محافظ ہیں
مگر
رات کو کیا پتہ کہ میرے پاس
نیند ہے
مَیں جب سوتا ہوں
تو رات شہر بدر ہو جاتی ہے

تالیاں بجانے کے لیے لٹکے ہاتھ

ہم تم میں باتیں تو نہیں ہوتی ہیں
پینٹنگز بنتی ہیں
جو تہہ خانوں میں
ہمارا انتظار کریں گی

غلہ منڈی کے آڑھتی آرٹ گیلریوں کی
سیاحت میں مصروف رہے
اور فیتہ کاٹنے پر تالیاں بجاتے رہے

ہمارے لفظوں کو رنگوں سے
مت پہچانو
لفظ رنگ سے اور رنگ لفظوں سے
بھرے پڑے ہیں

جو لوگ آتش دان کے سامنے
عبادت میں مصروف ہونے کی بنا پر
اپنے ہاتھ
تالیاں بجانے کے لیے
آرٹ گیلریوں میں لٹکا آئے ہیں
اُن کی تصویریں بھی اُن سے
بات نہیں کرتیں

چوگا کھلاتی مستورات

کڑکتی دوپہر میں
دیوار کے ساتھ لگی سائیکل کے پاس
مرغا بنا لڑکا
فارغ وقتوں کی نظمیں لکھ رہا ہے

خس کی ٹیٹوں کے پیچھے
بوڑھے ترازو سامنے رکھے
شاعری کر رہے ہیں

اُن کی ان چھوئی مستورات
مرغا بنے لڑکے کو
اپنا اپنا چوگا کھلا رہی ہیں

چولہے میں خراٹے

نیند مجھ سے چند قدم پرے
اُونگھتی رہی

ایسا جاگتے میں
سونے سے ہوتا ہے
ایسی نیند میں
آدھا چاند، آدھا بادل
اور
آدھے ستارے کے خواب آتے ہیں

کس ندی میں پانی ہے
کس ندی میں پیاس
یہ سمندر کے خراٹے بتائیں گے

ہم اپنی اپنی کشتی میں
چولہا جلانے کے لیے
پھونک مارتے ہیں
پھونک کہاں گئی؟
آگ کا ایندھن بنی
سمندر کا خراٹا بنی

یا

چند قدم پرے
اُونگھتی نیند کا خواب؟

پازیبیں، وہسکی اور تاش

اونٹ ہمارے پاس
اپنی گھنٹیاں چھوڑ کر چلے گئے
اور لڑکیاں اپنی پازیبیں

ہم نے کجھوروں کے بیچ
گیتوں کے جھولے ڈالے
اور زرہ بکتر ریت پر پھینک دیے
لڑنے والا
لڑائی میں عمر بتاتا ہے
اور گانے والا گیت میں

قافلے میں
نئے لڑاکے بھرتی ہوں گے
اور
لڑکیاں مورچوں میں
وہسکی، سگریٹ اور تاش بیچتی رہیں گی

نیند میں لکھے گئے لفظ

آج کی رات
مجھے میرے لفظ جگائیں گے
لفظ
جو مَیں نے نیند میں لکھے
نیند جس کو میں بستر میں تلاش کرتا رہا
خواب
میری کتاب میں
خراٹے لیتے ہوئے پکڑے جائیں گے
رات، نیند، خواب خراٹے
اور مَیں
لفظوں کو جگاتے رہے

بے گھری

ہم
کُرسی پہ سوتے رہے
اور
خواب بستر میں جاگتے رہے
خواب، بستر
اور نیند کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا
نیند بس سٹاپ پہ
جوتے پالش کرواتے آ سکتی ہے
بستر
دفتر کی میز پہ بچھا مل سکتا ہے
اور......خواب
گھر کے بلوں کے ساتھ
جیب کترے کے ہاتھ لگ سکتے ہیں

زوال کی بنیاد پہ کھڑی تہذیب کا عروج

گلی کے لیے چوکیدار
شہر کے لیے جیل
ملک کے لیے فوج ضروری ہے

خواب کے لیے نیند
نیند کے لیے بستر

زوال کی بنیاد پہ
کھڑی تہذیب کا عروج
مکینوں کی پیشانیوں پہ لکھا ہے
کچھ مکین یہ نام پیشانیوں پہ لکھوانے کے لیے
کثرتِ سجدہ کا شکار ہیں

پیشانیوں پر ٹیٹو کروانے والوں کی
قطاریں لگی ہیں

اُنھیں کیا خبر
رات آخری جام توڑنے والوں نے
فیصلہ دے دیا ہے
صبح پیشانیاں جسم کا حصہ نہیں رہیں گی

رات کی بے حرمتی

رات جوبن کی انگڑائی سے بچی
تو...... میرے ہاتھ لگی

دن میں رات
رات میں دن تلاش کرنا
سائنسدانوں کی روزی کا معاملہ ہے

سورج صدیوں سے
رات کی بے حرمتی کرتا آ رہا ہے

بس بہت ہو چکا
اب سورج چاند کا تعاقب چھوڑے
اور
رات کو آزاد کرے

رقص خوری ضروری نہیں

دریا
ابھی پیدا نہیں ہوا تھا
میرے اندر
سمندر نے جنم لے لیا
کشتی بنانے سے پہلے ہی
مَیں چاند کے بتھے چڑھ گیا

لڑکیاں
وہسکی، سگار اور گلاب جامن لیے
خشکی پہ کھڑی رہیں

سمندر کو سُننے کے لیے
غوطہ خوری ضروری نہیں
جس طرح
رقاصہ کو سُننے کے لیے
رقص خوری ضروری نہیں

کوئی چیز غیر موجود نہیں

غیر تمھیں کہیں بھی مل سکتا ہے

لڑکیاں سمندر میں

چاند بستر میں

اور

دریا واش بیسن میں نہاتے ہوئے

انصاف کی یونیفارم

جس انصاف کے لیے
یونیفارم کی ضرورت ہو
وہ صرف
ایک معاشرتی حقیقت ہے

معاشرہ اپنے پہیے
بدلتا رہے گا
انسان
خدا اور شیطان کی دوستی میں
مارا گیا

کیا ہر پنکچر پر
نئی یونیفارم کی ضرورت ہوگی؟

پھانسی میں مصروف شخص

لڑکی چوک میں
بوسہ اور گلاب کے پھول
ایک ساتھ بیچ رہی ہے

غیر مُلکی فوجی
یہ بوسہ خطوں میں ڈال کر
اپنی، اپنی بیویوں کو پوسٹ کر رہے ہیں
گلاب کا پھول
ٹوائلیٹ میں رکھے گئے
گلاس میں رکھ دیا گیا ہے
اُسی چوک میں
پھانسی میں مصروف ایک شخص
بوسے کا منتظر ہے

نیند میں کی گئی مشقتیں

یہاں مَیں ہوں
تم ہو

رات کی تنہائی میں
ہماری خواتین سو چکی ہیں
ان سے ہمارے خواب
نیند میں ملتے ہیں ۔۔۔۔مگر
ہم گھر کے بل آدھے آدھے
ادا کرتے ہیں
نیند میں کی گئی مشقتوں
کے بل کون ادا کرے گا

جگراتے کا خیمہ
کس میلے میں ملے گا

صحن کا اکلوتا انار

کٹائی کے موسم میں
تم کشتی بنانے بیٹھ گئے
صحن کا اکلوتا انار کاٹ دیا!

جیل سے چھوٹنے والے
کبھی گھر میں نہیں رہتے

کواڑ دیمک کا رزق بنے
پر چھتی پہ رکھے برتن
بھوک سے چُر مرا گئے

ونگار سے لوٹنے والے
گلی سے چٹخارے لیتے
گُزریں گے

اور

چوپال میں
ایک دوسرے کو
کشتی بنانے والے کا
قصہ سُنائیں گے

خواب نیند کو بے زار کر دیتے ہیں

خوابوں سے بچنا چاہیے
خواب
نیند کو بے زار کر دیتے ہیں
خوابوں سے بچنے کا واحد طریقہ
آوارہ گردی ہے
آوارہ گردی کرتے
بازو وقت سے
جیبیں شہر کے نقشے سے
خالی ہونی چاہئیں
گھڑی کی ٹِک ٹِک میں
کی گئی آوارہ گردی میں
خواب ہم سفر ہو جاتے ہیں

نیفے میں خواہشوں کا ذخیرہ

خواہشیں
درد کے بغیر پیدا ہوتی ہیں
اور
اپنے لمبے قد کی بنا پر
تابوت میں لیٹنے سے
انکار کر دیتی ہیں

تابوت کو اُٹھانے والا
تابوت کے اندر بھی لیٹا ہے
اور
تابوت کو جلاتا بھی ہے
وہ لوگوں کے شور میں
تینوں کام کر رہا ہے

لوگوں کا کیا ہے؟
لوگ تو
قلم سے شلوار کے نیفے میں
ازار بند بھی ڈال لیتے ہیں

قیدی کے ناخنوں میں
نیکوٹین
اور نیفے میں
خواہشوں کا ذخیرہ ہوتا ہے

دُھوپ میں کھلکھلاتے سیب

دِن
ہمیں گھیر رہا ہے
یہ ہماری رات کا
کمبل پھاڑ دے گا

یہ بات مَیں نے
سیب بیچنے والی
ایوا سے کہی

جب دو سیب
دُھوپ میں کھلکھلا رہے تھے

نظم کا وزیٹنگ کارڈ

ستارے نظم کے دوست ہیں
وہ دِن میں
اُسے پہچان لیتے ہیں
پرندے اُس کے گرد
اُڑتے رہتے ہیں
راستے اُس کی اپنی ایجاد ہیں
ہم اُسے
مورچوں، لڑکیوں اور
نیندوں میں ملتے ہیں
ہماری جیبیں خوابوں سے
خالی ہوتی ہیں
ہم نظم سے اُس کا پتہ پوچھتے ہیں
وہ کبھی ایک پر
کبھی ایک ستارہ
چھوڑ کر چلی جاتی ہے

باراتیوں سے بھری چھت

کیا یہ دِن بھی ہوا ہو جائے گا؟
مجھے چند لمحوں میں
پتنگ بنا لینی چاہیے

نظموں سے بھرے کاغذ
سیاہی کی ڈور
اور قلم کا بانس
میری مدد کر سکتے ہیں

چھت پہ باراتیوں کا شور
صحن میں پیڑ
گلی میں کرفیو
پتنگ لڑکی تک کیسے پہنچے؟

لفظ اپنے ننگے پن میں چھپ جاتے ہیں

شاعروں کا کیا کیا جائے
لفظ ان سے کیسے بچ پائیں
لفظ دِن بھر
دفتروں ،تارگھروں ،اخباروں
کمپیوٹروں ،عدالتوں ،خطبوں
نجوم گھروں ، بسوں ، اشتہاروں
نکاح ناموں ، طلاق ناموں ، درس گاہوں
اور
سرکاری بیت الخلاؤں میں
کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں
وہ شب خوابی کا لباس
پہننا شروع کرتے ہیں
تو
شاعر اپنے جگراتے سے
لفظوں کے کپڑے پھاڑنا شروع کردیتا ہے

انتقام

لفظ اپنے ننگے پن میں چھپ جاتے ہیں
شاعر رات بھر اپنی نظم کو نوچتا رہتا ہے

ٹینگو

مجھے
ایک پارٹی میں جانا ہے
مَیں موت کو گارڈروب میں
لٹکا آیا ہوں
پچھلے سال
مجھے یہ اسی پارٹی میں ملی تھی

والز میرے قدموں تک
پہنچتے ٹینگو بن گئی
راک، طفیل نیازی
میرے بلوز اپنا ہارپ
موت کی جیب میں بجاتے ہیں

خُداؤں نے موت ایجاد کی
انسان نے قہقہہ

جو رقص سے پہلے تھا

اور

تابوت پر گونجتا رہا

پارٹی میں آتے ہوئے

موت کو

خداؤں کے گاردروب میں لٹکا آنا چاہیے

شرابی قبر

موت

مجھے شراب سے نہیں بچا سکتی

مَیں اُس کے سائرن سُنتا رہتا ہوں

رات میں دونوں کی آوازیں

ایک سی لگتی ہیں

شراب تو قبر میں

بھی پی جا سکتی ہے

صرف

ایک پائپ

اور چند ہم پیالہ ہونے چاہئیں

کُبڑا اور سیپیاں چُنتی لڑکی

ساحل پہ سیپیاں چُنتی لڑکی
کو دیکھنے کے لیے
کُبڑا ہونا پڑتا ہے

آج تم جو
بڑے اور اصلی گھر میں ہو
کیا تم
پورے قد سے آتے ہو
یا
پورے قد سے جاتے ہو؟

چھوٹے گھر کی لڑکی نے
سیپیوں کو لمبا کر دیا ہے

دروازوں کو گزرگاہ سمجھنے والوں کے

پاؤں میں تالے ڈال دینے چاہئیں

اور

چابی تیسرے کو دے دیں

ٹہلتا ہوا بوسہ

مرے ہوئے لوگ
بوسوں کو تنگ نہیں کرتے
تمھیں چاہیے تھا
مجھے مزار پر بوسہ دیتی
تمھارے جانے کے بعد
اور تمھارے آنے سے پہلے
ہر طرف بوسے ہی بوسے ہوتے

مزار پر نچھاور بوسہ
ہونٹوں کے انتظار میں ٹہلتا رہتا ہے
مجھے سیر کرتے ہوئے
بس تھوڑی دیر رکنا پڑتا

تابوت کا ڈائننگ ہال

کیا
یہ محض اتفاق ہے
کچھ لوگ
زندگی شروع کرنے میں
دیر کر دیتے ہیں

منہ میں برگر
ایک ہاتھ میں موبائل
دوسرے سے دستخط کرتے ہوئے
گھٹنوں سے گاڑی چلاتے ہیں
لیموسین میں لٹکا کوٹ
دیکھتا رہتا ہے
فیتے کاٹتے شہادت کی اُنگلی سے
محروم ہو جاتے ہیں
اور

جب ایک دن
شیو کا سامان، فرانسیسی پرفیوم
نئے جرابوں کے جوڑے
اور
تحفوں میں ملی ٹائیاں
ردی کی ٹوکری میں پھینک کر
جلدی جلدی
زندگی شروع کرنے لگتے ہیں
تو
زندگی صاحبہ
تابوت کے ڈائننگ ہال میں بیٹھی
بارہ کورس کا کھانا
تناول فرما رہی ہوتی ہے

سورج میں نہائی رات

ہزار ہا صدیوں کی جدوجہد کے بعد
سورج ابھی
سوانیزے پہ آیا ہی تھا
کہ
رات نیزہ لے کر چلتی بنی
سورج کو
تارے نظر آ گئے

(نیزہ کسی کی حفاظت نہیں کرتا)

یہ بات رات نے سُن لی
اور.......سورج میں نہا گئی
سوا
یہ سب کچھ خلا سے دیکھتا رہا

خراٹے خاں

خوابوں کو

بے گھری سے بچانے کے لیے

مَیں نے

خراٹے خاں کی نوکری کر لی

خراٹے خاں

بیس نیند فیکٹریوں کا مالک ہے

مگر کوئی نیند فیکٹری

خواب نہیں بُنتی

مزدور اپنے خواب

ٹفن کیریئر میں ساتھ

لے کر آتے ہیں

مگر

سائرن بجتے ہی

خواب

خراٹے خاں کی جیب میں
چلے جاتے ہیں
مزدور
کل کا ٹفن کیریئر بھرنے کے لیے
رات بھر بھوکے
کام کرتے رہتے ہیں

خودکشی ایک محنت طلب کام ہے

خودکشی ایک محنت طلب کام ہے
مگر
جو ڈاکٹر اس میں رکاوٹ
ڈالتے ہیں
وہ ہزار ہا خودکشیوں کا
سبب بنتے ہیں
ایک ڈاکٹر سو مخنتی بناتا ہے
مخنتی کے پاس
وقت کم اور کام زیادہ ہے
کہیں ایسا نہ ہو
موت آپ کو حساب کتاب
میں مصروف کر دے
اور
خودکشی ڈاکٹر کے ہاتھ لگ جائے

خواب گاہ کے پردے

خزاں کھڑکی پہ
دستک دے رہی ہے

''زردہ پکانا چاہیے''

خزاں کے پتے
چاولوں میں ڈالو
زردہ اپنا رنگ پکڑ لے گا
تم کھڑکی میں کھڑے
شیواز پیتے رہو
خواب گاہ کے پردے
چاند کے تعاقب پر چھوڑ دو
زرد خواب کی تعبیر
تم
ہوروسکوپ میں دیکھ سکتے ہو

نیند میں دن کی جگالی

ہر خواب
ہر نیند کے ساتھ نہیں سو سکتا
خواب
اپنی پسندیدہ نیند کے انتظار میں
رقص گاہوں، شراب خانوں
عجائب گھروں، قحبہ خانوں
سُنسان گلیوں
ڈسٹ بِن میں پھینکی گئی تعبیروں
اور دماغ کے جامد خلیوں میں
سویا رہتا ہے

نیند میں دِن کی جگالی کرنا
خواب کی توہین ہے
دِن میں خواب کو بلانے والے
خواب کا رستہ کھوٹا کر دیتے ہیں

خواب

ایسی نیند کی تلاش میں ہے
جو اُس کی قیام گاہ نہیں
گذر گاہ ہو

منہدم عمارت سے ایک منظر

خارش زدہ شہر
اپنے باخات کھرچ گئے
لوگوں نے
بھونک بھونک کر
صحن کا موتیا بُجھا دیا
قحبہ خانوں میں
خارش کی دوا کثرت سے بک رہی ہے
جب سے
بارش میں میونسپل کمیٹی کا دفتر
منہدم ہوا ہے
شہر میں آوارہ کتوں اور
خارش زدہ لوگوں کا
جمِ غفیر ہے
عورتیں

سفید دستانے پہنے
لنگر تقسیم کر رہی ہیں
لیکن
چوڑیاں پھر بھی کھنک جاتی ہیں
جس پر
لوگوں میں خارش تیز ہو جاتی ہے
کتے زیادہ بھونکنے لگتے ہیں
اور
سیلابی ریلے میں شدت آ جاتی ہے

کفن کی پھڑ پھڑاہٹ

زندگی ہمیں
افواہ کی صورت ملی
اس کی حقیقت جاننے کے لیے
ہم
اپنے کانوں پہ تھپڑ مارتے رہے
اخبار کی اس خبر نے
شہر میں تہلکہ مچا دیا
کہ
ایک بکری پہ مقدس نام
لکھا پایا گیا

مَیں جب
اُس کے خطوط کا بنڈل واپس
کرنے گیا
تو اُس نے کہا

مَیں نے تو تمھیں کبھی خط نہیں لکھا
میرے سارے عشقیہ خطوط
نوکری کی درخواست میں
پکڑے گئے

افواہیہ زندگی کے عادی
موت سے نہیں ڈرتے
مگر مَیں
کفن کی پھڑ پھڑاہٹ میں سوچتا ہوں
کیا
موت بھی افواہ کی صورت ملے گی؟

نظم لڑکی کے ہونٹوں پہ گنگنا رہی تھی

رات ،لڑکی اور نظم کو مَیں نے
شراب خانے کی سیڑھیوں پہ گرا پایا
جب میرے اوور کوٹ کی جیب میں
رات ،لڑکی اور نظم
مہک رہی تھیں
تو نظم لڑکی کے ہونٹوں پہ
گنگنا رہی تھی

رات ،لڑکی اور نظم کو
ٹھٹھرنے سے بچانے کے لیے
مَیں نے
اپنا اوورکوٹ اُن پہ ڈال دیا

ٹکٹ چیکر کے استفسار پر

مَیں نے خود کو برہنہ پایا

نظم

مجھے اُس سُنسان اسٹیشن کی
انتظار گاہ میں ملی

جب
رات اور لڑکی ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے
رخصت ہو رہی تھیں

دوستوں کو شاپنگ کرتے دیکھ کر

تمھاری خامشی
ہماری نظم کو گونگا نہیں کر سکتی
نظم جب تمھارے دروازے پہ
دستک دیتی ہے
تو تم میلے کپڑے اُٹھائے
دروازہ کھولتے ہو
مگر تمھیں دھوبی نہیں ملتا

تمھیں رات بھر کرسی پہ اونگھنا پڑتا ہے
کہ بستر پہ پڑی نظم کی شکنیں
تمھارے بدن پہ خراشیں نہ ڈال دیں
تم ہماری نظم سے بچنے کے لیے
دِن بھر کام کرتے ہو
اور کافی کے ایک کپ میں
افسر کی چار چار شاباشیں گھولتے ہو
تمھاری محبوباؤں کے ہونٹ

نہ مرنے کا عہد

میرا
تم سے عہد ہے
مَیں کبھی نہیں مروں گا

موت اور پیدائش
میرے وعدے میں
پیدا ہوتی اور مرتی رہیں گی

لڑکی
کبھی تم نے محبت کا
قبرستان دیکھا
کتبوں پر تو صرف
پیشے، ذاتیں اور عمریں لکھی ہوتی ہیں

لفظوں سے اٹی درسگاہیں

جن کی زبان لمبی ہوتی ہے
اُن کے دماغ چھوٹے ہوتے ہیں
وہ زبان گرم مصالحے میں
بھون کر کھاتے ہیں
لفظ
اُن کی ریڑھ کی ہڈی میں مُنجمد رہتا ہے
بات کی افزائشِ نسل کا
ذہن کے ارتقا سے کوئی تعلق نہیں
معانی
اگر باہر نکل آئیں
تو
لفظوں سے
اٹی درسگاہیں
زمین بوس ہو جائیں

ہماری نظم نے سرخ کر دیے ہیں
اب وہ تمھارے بوسوں سے
اپنے ہونٹ سیاہ نہیں ہونے دیں گی

تم شہر سے بھاگنے کے لیے
بس پکڑو گے
تمھیں ہماری نظم کے سٹاپ پر اترنا پڑے گا
جہاں فاختاؤں اور
جنگلی کبوتروں کی غٹرغوں میں تمھیں
اپنی شاعری یاد آئے گی
جو ہماری نظم کی انگلی پکڑے
تمھارے دروازے پر تمھاری منتظر ہوگی

....

نوٹ۔ قاری اس نظم کو پڑھنے سے احتراز کرے۔ یہ صرف چند خاموش دوستوں کے لیے لکھی گئی۔

تیسرے تم ہو

کھڑکی سے آیا ہوا مہمان
لمبا ہوتا جا رہا ہے

دُھوپ ڈھل بھی سکتی ہے
سایہ پھنس بھی سکتا ہے
کھڑکی بند بھی ہو سکتی ہے

کیا اس حالت میں
مہمان میزبان بن جائے گا؟

کھڑکی وہی ہے
قد وہی ہے
دُھوپ وہی

ایک پہیے کا آتش دان

تم گاڑی چلاتے ہوئے
ساتھ والی سیٹ پہ بھی کیوں
بیٹھتے ہو
کیا
اس سیٹ کا مسافر
ناشتے میں نمک زیادہ
ہونے کی بناپر
گھر میں بیٹھا فلمیں دیکھ رہا ہے
پودوں کی کھاد تبدیل کر رہا ہے
وال پیپر کو لیوی لگا رہا ہے
یا
آتش دان کے پاس بیٹھا
ٹریفک کتابچے کی قرأت کر رہا ہے

کیا تم نے بچپن میں
ایک پہیے والا سائیکل نہیں چلایا؟

اسی لیے
تمھیں دو سیٹوں پہ بیٹھ کر گاڑی
چلانے میں کوفت محسوس ہوتی ہے

گاڑی ایک سیٹ کی ہو یا دو کی

اب وہ
ٹریفک کتا بچہ
اور
پلاسٹک کی بنی لیموسین
آتش دان میں پھینک چکا ہے
اور کھڑکی میں کھڑا
مداری کو ایک پہیے کے آتش دان سے
گزرتا دیکھ رہا ہے

تابوت سے بھاری وصیت نامہ

بچہ
ماں کے پیٹ سے
بوڑھا پیدا ہوا
اور
قبر تک جاتے ہوئے
بچہ رہا
وارثوں نے اُسے
وصیت کی خاطر
بوڑھا قرار دے دیا
مگر وہ
زندہ رہنے کے لیے
خالی ہاتھ نہیں جانا چاہتا
موسیقی، تصویریں، کتابیں
اور بوتلیں ساتھ لے گیا
وارثوں کے ہاتھ

وصیت تھما گیا

جو تابوت سے بھاری
مگر لفظوں سے خالی تھی

ارزللمخلوقیت کی پکنک

بلی کو کہیں نہیں جانا

تم

بلی کو دودھ پلا کر

سیدھے جنت میں جا سکتے ہو

کتے کو کہیں نہیں جانا

تم

اُس سے مصافحہ کر کے

سیدھے دوزخ جا سکتے ہو

سور کو کہیں نہیں جانا

مگر تمھیں اُسے

پکارنے کی سزا ملنے والی ہے

جنت اور دوزخ

اشرف المخلوقات سے بھرے پڑے ہیں

پرندے، جانور، شجر، حجر

باہر
اپنی ارزللمخلوقیت کی پکنک منا رہے ہیں

کبھی بھیڑیے کو گُنگناتے سُنا ہے؟

خرگوشوں کی کئی قسمیں ہوتی ہیں

لیکن

کبھی بھیڑیے کو

گُنگناتے سُنا ہے

یہ تو وہ وحشت ہے

جو

آرائے بازار جاتے ہوئے

نومبر کی ڈبل ڈیکر کی

گڑگڑاہٹ میں بھی

نہیں ہوتی

تم نے ساٹھ کی دہائی میں

لاہور بسر کیا ہوتو

تمھیں پتہ ہو

بھیڑیے

اچھرے اور چوبُرجی کے درمیان

گشت کیا کرتے تھے

۷۷

میانی صاحب کے قبرستان میں
ہوا اُٹھکیلیاں کرتی
تو
مُردے مالکونس گاتے
اور
مال روڈ پہ چلنے والے
میٹھے جامنوں سے
اپنے ہونٹ رنگین کرتے
رنگین ہونٹوں پہ زبان پھیرتے
اُن جامنوں کا ذائقہ
آج برسوں بعد
تمھارے پستانوں میں پایا

سچائی کون سا کتبہ پہنے لیٹی ہے؟

فاختہ

برسات کے موسم میں
آم کے درخت پہ بیٹھی
گیت تو نہیں گا رہی
گیت تو کوئل گا رہی ہے

کوئل کے ہجر
اور تمھارے وصل میں
کچے آم ٹپک رہے ہیں
کچے آم کی خوشبو
اور
تمھارے پھوٹتے پستانوں میں
(جو پینتیس برس پہلے پھوٹے)
کُچھ تو قدرِ مشترک ہے
سچائی

کس قبرستان میں کون سا کتبہ پہنے
کس خوابِ خرگوش کے
مزے لے رہی ہے
اس کا تو خرگوش کو بھی پتہ نہیں ہوگا
خرگوشیاں کرتی لڑکی
مَیں نے
پینتیس سال
تمھارے سینے کے کبوتروں کے
پھڑپھڑانے کا انتظار کیا

وقت کہیں نہیں ہے

مَیں
ساری رات خواب دیکھتا رہا
صبح بستر لپیٹتے
نظم اور نیند سے ملاقات ہوئی
تو مجھے احساس ہوا
مَیں وقت سے پہلے جاگ گیا ہوں

مَیں
پھول لیے قبرستان میں
انتظار کرتا رہا
مگر
لوگ مجھے وقت سے پہلے
دفنا کر جا چکے تھے

قطار میں طویل مسافت
طے کرنے کے بعد

کاؤنٹر پہ پتہ چلا
اس گاڑی کو اگلے ہفتے
روانہ ہونا ہے
عورت
یہ طعنہ سُنتے سُنتے
وقت سے پہلے فوت ہوگئی
کہ مَیں وقت سے پہلے
پیدا ہوگیا تھا

وقت کہیں نہیں ہے
صرف مَیں ہوں اور تم ہو
اور
تیسرا ہمارے اندر ہے

گردن کے ناپ کا ازار بند

نواب کی زیرِ نیفہ
جنم لینے والی اولاد نے
ازار بند کو
نواب کی گردن میں
کیسے ڈالا

روڑی کوٹنے والی عورت کو
حاملہ کس وقت کیا گیا
کیا اُس دِن
مذہبی یا قومی تہوار کی چُھٹی تھی

یا
عورتوں کا عالمی دِن تھا
جسے ہر مرد
پورے جوش وخروش سے مناتا ہے

محنت کش روشنی سے نہائی رات

رات کے پنگھوڑے میں

دن
تمھاری آنکھیں خیرہ
کرنے کے لیے آیا
تم نے کھیتی باڑی شروع کر دی
اسی دوران ملنے والی
ایک پیلی دھات نے
تمھاری آنکھیں اور بھی
خیرہ کر دیں
دھات کو پرکھنے کے لیے
تم نے
آگ ایجاد کی
زیور کو پرکھنے کے لیے
عورت
تم اپنی چندھیائی آنکھوں سے
دن بناتے رہے

اور رات کو
دِن کی محنت کش روشنی
سے نہلا دیا

آگ میں جلتی برف کی آواز

کیا تم نے کبھی
برف میں آگ کو جلتے سُنا ہے؟
مَیں نے
درختوں پہ برف کھلتے
دیکھی ہے
جب
اُن آنکھوں پہ بھرپور جوبن تھا
سرِ شام
فرانسیسی کونیاک پیتے ہوئے
اُس کے آنسو اوپیرا گاتے
وہسکی جیسے جیسے
برف جذب کرتی جاتی ہے
اور
گرم ہوتی جاتی ہے
مگر

تم اپنی ناسمجھی میں
ٹھنڈی وہسکی پیتے رہے

تمھارا تحفے میں دیا ہوا
لحاف مَیں نے
برف میں جلا دیا ہے
تم
اُس کی آواز تب سنو گی
جب
اوپیرا ساتویں سُر کو چھوئے گا

برف نامہ

اب یہ گلیاں
برف میں اٹ جائیں گی
کمرہ چھوڑنے کے
ایک دو جواز
بھی معدوم ہو جائیں گے

واہن میں پھرنے والا
برف میں چلنے سے قاصر ہے
مگر
برفانی ریچھ کھڑکی کو ہاتھ لگا چکا ہے

تم کمبل میں
زیادہ دیر تک محفوظ نہیں رہ سکتے

پچھلی برف میں پوسٹ کیا ہوا خط

اس برف میں واپس آ گیا ہے
کہیں جانے کی ضرورت نہیں
کونیاک اور وہسکی نے
تمھارے اردگرد
حصار کھینچ لیا ہے
کوئی آفت تم تک نہیں پہنچ سکتی

مگر
بوتلوں کا ذخیرہ کب تک
برفانی ریچھ
کھڑکی کے باہر ٹہل رہا ہے

امتحانی کمرے کی سیج

صدائیں
اپنی تہذیب کھو چکی ہیں
بلانے اور دھتکارنے میں
کوئی فرق نہیں رہا

شگنوں کے گیت
ماتمی جوش و خروش سے
گائے جاتے ہیں

ایف اے میں
فیل ہونے والی چیخ
لڑکی کے مائیوں میں سُنی گئی
مگر
امتحانی کمرے کی طرح
سیج پہ
لڑکی نہیں بدلی جا سکتی

برف میں دبی خزاں

برف
کے نیچے دبی خزاں پکار رہی ہے
ابھی تو
میرے رنگوں نے
جنگل کو آگ لگائی تھی
پیڑوں کو برہنہ کیا تھا
آوارہ قدموں نے
میری پازیبیں پہنی تھیں
شاعروں نے شاعری
شروع کی تھی
سہاگنیں
روپہلی چوڑیوں کے شیڈ
منتخب کر رہی تھیں
پہلی تال پہ دھمال کا آغاز ہوا تھا

ابھی تو
سورج میری آگ میں
نہا رہا تھا
یہ منجمد سفید آبشار کس نے انڈھیل دی

قبر کی مصروفیات

پیدا ہونے کی مصروفیت
جنازے کی گہما گہمی میں
کُچھ دیر تھم جاتی ہے
مگر
اپنا کام فرشتوں کو
سونپنا نہیں بھولتی

قبر کی اپنی مصروفیات ہیں

ہر چیز تباہ ہونے میں
مصروف ہے
مصروفیت کو تباہ کرنا
تباہی کے بس کی بات نہیں

فرشتوں کی بے روزگاری

دُنیا میں
طبعی موت کی رسم
ختم ہوتی جارہی ہے
طبعی موت کا جشن ضروری ہے

سوگ مناتے ہوئے کام کرنے سے
موت بے رونق ہو جاتی ہے
قبرستان مقتولوں سے بھرے
پڑے ہیں
حادثات پہ کب تک
گُزارہ ہوگا
طبعی موت کے مخصوص کونے میں
سال ہا سال سے کوئی خاکِ خیمہ
وجود میں نہیں آئی

فرشتوں کو بے روزگاری سے
بچانے کے لیے
طبعی موت کا ہونا ضروری ہے

بڑے پانی کا شور

خیال کے پُل پہ مَیں
بہت دیر جھولتا رہا
ندی کی شائیں شائیں سنائی دیتی رہی
ندی نظر نہیں آئی

خشکی کے زمانے میں
پُل خوشی سے جھولتا رہتا ہے
بڑے پانی کا شور
پُل کو ڈرپوک بنا دیتا ہے

پُل جھولنا چھوڑ کر
خود کو ایک کنارے میں لپیٹ لیتا ہے
جھولتا آدمی ریت پہ نظمیں لکھتا رہتا ہے۔

قہقہے میں اُداسی کے جال

ہر قہقہے میں
اُداسی کے جال ہوتے ہیں
قہقہے اور اُداسی میں
ایک سانس کا فاصلہ ہے

آتم پر دھیان کرنے سے
بدھ مل سکتا ہے

قہقہہ اور اُداسی
ایک دوسرے کی پشت پناہی
کرتے ہیں
اور آدمی کے گرد
دائرے میں رقص کرتے ہوئے
اُسے ہنباہ دیتے ہیں

کیا اس رقص کو توڑ کر
انسان بچ سکتا ہے

مگر

بچنا کس سے ہے

قہقہے، اُداسی، زندگی سے

؟

مسافرت کا نشان منزل سے نہیں ملتا

ہم
فلسفوں کی بُنگالی
جنگلوں کی ہریالی
زرد پتوں کی پازیبیں
اور
لڑکیوں کی ہنسی
چھوڑ کر کہیں بھی جا سکتے ہیں

کہیں جانے کے لیے
کہیں جانا ضروری نہیں ہے

کل ساری رات
بادل میرے ساتھ رہا
چاند

بلندیوں کی وجہ سے

نظر نہیں آیا

معجزے تمھیں منطق سے

رہا کر دیتے ہیں

نفی اثبات کا لباس

ہر موسم میں پہنا جا سکتا ہے

ٹِک ٹِک کے خلاف محاذ آرائی

وقت سے پہلے وقت تھا
وقت کے بعد وقت ہوگا
اس عرصے میں
تم جو بھی کروگے
گھڑی کی سوئی
اُس کو اپنے ساتھ گھماتی رہے گی
گھڑی کا شیشہ توڑنے سے
تم وقت سے باہر نہیں نکل سکتے

اپنے ذہن میں
خلا پیدا کرو
وقت کی قوس ٹیڑھی ہو سکتی ہے

اس سے پہلے کہ
گراریوں میں چلتا وقت
تمھارا قیمہ کر دے
دندانوں کے تصور کو
ذہن سے جھٹک دو

جزیرے کی پیدائش کا گیت

دریا سمندر میں شامل نہ ہوں
تو
سمندر جزیروں پہ
بھیک مانگتے پھریں
جزیروں کے باسی
سمندر کو ناریل دھونے کے لیے
استعمال کرتے ہیں
سمندر
اپنی حرکات سے
جزیروں میں بسنے والوں کو
نہیں ڈرا سکتا
وہ
طوفانوں کی بھرپور جوانی میں
ساحل پہ بچوں کو جنم دیتے ہیں

سمندر

جزیروں کے باسیوں کو
ننگا نہیں کر سکتا
کیلوں کے پتوں سے
جزیرے بھرے پڑے ہیں

وحشت سے آزاد ہو کر
کوئی کہاں جا سکتا ہے
کسی دوست کو ملنے

یا
کسی سُنسان رستے میں
گُم شدہ محبوبہ کی یاد میں ٹہلنے؟
زیادہ جگہیں سمندر نے گھیر رکھی ہیں
جزیرے کی پیدائش
سمندر کے خلاف احتجاج ہے

برف کے مکتوب پہ سورج کی مہر

جب مَیں نے
جمے ہوئے لیٹر بکس کو
توڑ کر خط نکالا
تو
برف کے مکتوب پہ
سورج کی مہر تھی
مَیں خط پکڑتے ہی پھسل گیا
مَیں اپنی اُنگلیوں میں
اُس کی خوشبو محسوس کر چکا تھا
لشکارے اور خوشبو نے
یک بیک مجھ پہ وار کیا
مَیں نے
بھڑ بھڑاتے ہوئے
خوابوں کی فہرست لحاف کے سپرد کی

اور

اگلی سردیوں کے لیے

لحاف اوڑھ لیا

سفر برف کا تودہ بن چکا ہے

گلاس میں پڑی برف کے پگھلنے کا
تم ساری رات انتظار کر سکتے ہو
مگر
سمندر پر جمی برف پہ
تمھاری ٹانگ کسی وقت بھی
مچھلی کے ہاتھ لگ سکتی ہے
بادامی آنکھوں کی کشش نے
تمھاری یادداشت خراب کر دی ہے

نیم دُھندلکے میں
کی گئی ملاقاتوں کی یاد
اپنا رنگ بدلتی رہتی ہے
آنکھ میں جمی برف
کس یاد کا رنگ پکڑے گی

مچھلیاں رنگ بدل رہی ہیں
گلاس میں آگ لگی ہے
سفر برف کا تودہ بن چکا ہے

فرشتوں کی ڈاک

فرشتوں کی ڈاک میں
کبھی کوئی خط نہیں ملا
صرف
قرضوں کی ادائیگی کے
احکامات ملے
جو
ہم نے کبھی نہیں لیے

جُوا
ہم نے سُستی کی وجہ سے چھوڑا
اور
آوارہ گردی
آوارگی کے زُعم میں
آڑے آنے والے کاموں سے
ہم نے بے تعلقی رکھی

جن قرضوں کی بنا پر
زندگی ضبط کی گئی
قبر میں اُن کا
نام و نشان تک نہ تھا

دو کانوں اور کمروں میں کھڑی کتابیں

لفظوں کا کفن اوڑھے
خیال
کتاب میں سطر سطر لیٹے ہیں

ہمارے درمیان جو
پیدا ہوا اور پروان چڑھا
کیا
وہ کتاب کے صفحوں
میں مل جائے گا؟

دو کانوں اور کمروں میں
صف بہ صف کھڑی
کتابوں کی
ورق گردانی ضروری ہے

حماقت کے زور پہ مرنے والے

موت
جو
پیدائش کی طرح
واحد متکلم ہے
اُس سے کب تک
مکالمہ کیا جا سکتا ہے

شیشم کے تنے پہ کھودے گئے
محبت نامے
جوتے کی ایڑی میں اُبھری
کیل کی طرح چُبھ رہے ہیں

موت کا پیدائش سے کوئی تعلق نہیں
صرف وقت ہے
جو تمھیں کہیں بھی مل سکتا ہے

وقت نے تم کو
موت اور پیدائش سے روشناس کرایا

وقت نے
تمھارے کانوں میں
بھجن گائے، اذانیں دیں
اور
حماقت کے زور پہ
مرنے والوں کے رجز سُنائے

درختوں میں چُھپی زندگی

بچپن میں ملے درخت
تم سے کبھی جدا نہیں ہوتے
جب اُن کی داڑھیاں
تمھارے بڑھاپے میں
گدگدی کرتی ہیں
تو
تمھیں نوجوان لڑکیاں نظر آتی ہیں
تمھاری زندگی
تمھارے درختوں میں چُھپی
تمھارے اندر رُگتی رہتی ہے
درختوں کو
تم سے کُچھ نہیں چاہیے
صرف
امر بیل کو تابوت کے لیے سنبھال رکھو

خالی کاغذ کے لطیفے

خالی کاغذ سامنے پڑا
دِن بھر سے لطیفے سُنا رہا ہے
شام
بے بہری شام
نوحوں کی توقع پہ
رات کا دروازہ کھٹکھٹا رہی ہے
دروازہ اپنا ایک پٹ
نوحے کے لیے
دوسرا لطیفے کے لیے کھولتا ہے
اندر
چکاچوند چاندنی میں
لڑکی کسی اور کے رباب پر
تمھارا رجز گا رہی ہے

قربانی کے دن سویا ہوا بچہ

سورج کے پُرزور اصرار پر بھی
بچے نے
سنو مین کو پگھلانے سے
انکار کر دیا ہے

آدھا سال
بکرے کو اپنی چیونگم کی جگالی
کروانے والا بچہ
قربانی کے دن سویا رہا

بچہ
جیک لنڈن بچہ
جس نے اپنے مکان کو جلتے دیکھا

اور کہا......'' شکر ہے
مَیں آگ لگانے والوں میں
شامل نہیں ہوں''

کوے کی شاگردی

بندروں نے جنگل چھوڑا
آدم نے
درخت پہ کلہاڑا چلایا
لیکن
قابیل نے جب
کوے کی شاگردی کی
تو
عدالت کا اجلاس لگا

گناہ
انصاف کی پیداوار ہے
انصاف
جس نے بندروں، درختوں

اور
کوے کو نہیں دیکھا

وہ
فیصلے کے لفظوں کا
گلہاڑا گلے میں ڈالے
حجلۂ عروسی میں جا رہا ہے

دل دہلاتے رہتے ہیں

غلطی کی پیدائش

اور

موت کے پھول

ایک سے ہوتے ہیں

غلطی کی یاد

ہر سال منانی پڑتی ہے

اس دوران بلند کیے گئے نوحے

دل دہلاتے رہتے ہیں

غلطی کی یاد کی پاداش میں

غلطی جنم لیتی ہے

جس خطے میں

غلطی دفن کی جاتی ہے
زندگی وہیں
پھول چُنتی ہے

پانچ پہیوں کا مستقبل

حال ماضی کو
متنازعہ بنا دیتا ہے

عورت
تمھارے لیے جب
ٹائی خرید رہی ہوتی ہے
تو
اپنے کلاس فیلو کی گرہ
اُس کے ہاتھ میں ہوتی ہے
دو پہیوں کا سائیکل
چلاتی عورت کو
مستقبل میں ایک پہیے پہ
پاؤں چلانے پڑتے ہیں

ایوا کی خوش گپیاں
آخری سیب کے بکنے تک ہیں

تمھارا پانچ پہیوں کا مستقبل
ایک پہیے کی سائیکل پہ
لوٹنے والا ہے

برف کے نیچے مُرجھائے پھول

باہر
برف کے ساتھ ساتھ
شام گر رہی ہے
اندھیرا اور سردی
ہمیشہ اداسی کے ساتھ ساتھ
کیوں رہتے ہیں
کیا مَیں نے تم کو گنوا دیا ہے؟
رگوں میں چھُپی ہوئی معصوم حرارت
بولتی کیوں نہیں
فضا کی تمام آلودگی
برف کی سفیدی ختم نہیں کر پائی
مگر میرے جوتوں نے
برف کو داغدار کر دیا ہے

برف کے نیچے جڑ مرائے
خزاں کے پھول
میری بہار کے رستے میں کھلیں گے

زبان کی لکنت اور چور دروازے

قلعہ حملہ آور کو
مدِ نظر رکھ کر تعمیر کیا جاتا ہے
حملہ آور کی دلچسپی
مکینوں سے ہے
چور رستوں کے محافظ
اور
مخبر ایک سی شکل کے ہوتے ہیں

تم
اس محفل میں مجھ سے
کب تک بیگانہ رہ سکتی ہو
ہم ایک دوسرے کو
ہاتھوں سے ناپتے رہے

زبان کی لکنت
پڑھے ہوئے لفظوں کی
ہزیمت کا پیش خیمہ ہے

بہت دیر تو مَیں پیدل ہی چلتا رہا

تمھاری یاد پہ ان دنوں
زندگی یوں رواں دواں ہے
جیسے
سمندر پہ جمی برف پہ
بہت سے لوگ
سکیٹنگ میں مشغول ہوں

بارات کے پُہنچنے پہ
فوت ہونے والا
کس دُھن پہ رخصت ہو؟
رخصتی کے لیے صرف
ایک ہی بینڈ ہے

بہت دیر تو مَیں
پیدل ہی چلتا رہا
پھر مجھے
مشینوں سے ٹکٹ نکالنے کا
فن آ گیا
تمبا کو کو کاغذ میں لپیٹنا
مَیں نے آوارہ گردی
سے سیکھا
برف میں سوراخ کر کے
مچھلی نکالنا
مجھے تمھاری یاد نے سکھایا

ندی کی خوغرضیاں

سورج اور برف کی رقابت میں
ندی کیوں
پھول جاتی ہے
کنارے سمٹنے کی کوشش میں
اُکھڑ جاتے ہیں
تم نہیں چاہتی
دُھوپ
برف کا بوسہ لے
تم نے
دُھوپ کو الاؤ بنا دیا ہے
الاؤ کے گرد
رقص کرتے

تم اپنے پاؤں
کب تک بچا پاؤ گی

پاؤں کی سانس کا توازن

رقص کرتے
بارش کے بہاؤ میں
بھیگنا پڑتا ہے
بادل کے سم کا
دھیان رکھنا پڑتا ہے
آنکھ کے اشارے
ہوا سے سیکھے جاتے ہیں
پاؤں کی سانس کا توازن
زمین سے نکلنے والی
آواز بتاتی ہے
جب سب عناصر
رقص میں ہوتے ہیں

تو
رقص کی گونج
رعدِ قیامت کو
بے آواز کر دیتی ہے

سپورٹس میں سائنس کا نفاذ

بھاگنے والوں کے نیچے
زمین بھاگتی ہے
مگر
زمین کو کبھی انعام نہیں ملا
آگ، عورت
اور زمین
ایک ساتھ پھیرے لیتی ہیں

خطِ مستقیم پہ بھاگنے کا
کوئی فائدہ نہیں
سپورٹس میں
سائنس کا نصاب
شامل کیا جائے

گلاسوں میں پڑے دن

مَیں ساری رات
سال پیتا رہا
ہر گلاس کو مَیں نے
تین سو پینسٹھ دنوں میں ختم کیا

گلاس میں پڑے کچھ دنوں نے
مجھے برف کے تودے میں لگا دیا
اور کچھ دنوں نے تمھارے بدن کی
گرمی میں

میز پہ پڑی کسیلی چائے
اور ادھ پیئے سگریٹ
جلنے بجھنے لگے

خالی جیبوں میں آگ بھڑک اُٹھی
چاروں طرف سڑکیں جگمگا گئیں
جہاں ہمارے خواب
ساری ساری رات جاگتے تھے

دیوار پہ ٹنگی زرد گروپ فوٹو نے
ہر طرف اودھم مچا دیا
گلاس میں کسی نے وہ کھٹائی انڈھیل دی
جو گول گپے کھاتے ہوئے
تمھاری ہنسی سے چھوٹی تھی

مَیں نے
تین سو پینسٹھ دنوں سے لبریز
سارے گلاس
آتش بازی میں چلا دیے

دیوار پہ پھیلی افواہ

محبت اور نفرت
اضافی ہیں

دیوار پہ پھیلی افواہوں سے
درزی نے بخیہ گری سیکھی
افواہوں کے رزق سے
ناشر نے پانچ رنگے
ایڈیشن چھاپنا شروع کر دیے

جو لوگ افواہ میں محبت کرتے ہیں
افواہ ان کی محبت کا
کبھی تحفظ نہیں کرتی

خوبصورت لباس میں
آتش دان کے پاس
رنگین کتابیں پڑھنے والے
محبت اور نفرت پہ
اپنے سکارف اور
اپنی ٹائی کی گرہ لگاتے ہیں

افواہ نے قبرستانوں کو زندگی بخشی
مگر قبرستان
افواہ کی قبر سے خالی ہیں